

وفیات

ہے رشک اک جہان کو "سرو" کی موت پر

ڈاکٹر محمد گلایل اوج

شعبہ البلاغ عامہ جامعہ کراچی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر، سرور نسیم کی یاد میں

جامعہ کراچی کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ میرے مرحوم دوست سرور نسیم کا تھا۔ جن کا ۱۶ فروری ۲۰۰۷ء کو اچانک انتقال ہوا۔ اس سانحہ پر جامعہ کی فضا سو گوار اور ہر آنکھ اٹکھار تھی۔ اتنی کثرت اور ایسا اثر و حام اس سے پہلے دیکھنے میں نہ آیا۔ مرحوم اپنی عمر کے اڑتالیسویں سال میں تھے۔ بظاہر ہشاش بشاش، تندرست و توانا اور صحت مند دکھائی دیتے تھے سوائے اس کے کہ گزشتہ کئی ماہ سے بلڈ پریشر کی شکایت بتاتے تھے۔ اور اسکے لئے وہ خاصے فکر مند بھی تھے۔

مرحوم سے میری دوستی کا رشتہ اس وقت قائم ہوا۔ جب میں پروفیسر ڈاکٹر محمد قیصر کی اسٹوڈنٹ ایڈوائزری ٹیم میں بطور اسٹنٹ شامل ہوا۔ مرحوم اس ٹیم میں بہت پہلے سے شامل تھے۔ اس طرح تقریباً روزانہ ہی کبھی کم اور کبھی زیادہ وقتوں کی ملاقاتیں رہنے لگی تھیں۔ انکی خوش مزاجی میں سنجیدگی کی لمونی تھی۔ وہ طلبہ تنظیموں کو شفقت و محبت سے ڈیل کرنے کے قائل تھے۔ طبیعت میں صلہ پسندی کا جو ہر بھی مبداء فیاض سے دو بیعت ہوا تھا۔ حقدار کو حق دلانے میں پیش پیش رہتے تھے اور اگر کسی کا حق مارا جاتا تو مضطرب ہو جاتے تھے۔ تقریباً دو سال تک ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس عرصہ میں میں نے انہیں بلا مبالغہ ایک با اخلاق، با اصول اور شریف النفس انسان پایا۔ ان کے سانحہ ارتحال پر انکی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ان کے متعدد دوستوں نے جو اظہار خیال کیا ہے۔ وہ اظہار واقعی ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شرافت و دیانت اور

اصول پسندی کا دورانیہ فقط دو ایک سالوں پر نہیں بلکہ انکی پوری زندگی پر مستولی تھا۔

ان کی وفات سے ایک ہفتہ قبل ان سے میری آخری اور یادگار ملاقات ہوئی تھی۔ میں ان سے ملنے ان کے دفتر گیا تھا۔ اس ملاقات کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس بار انہوں نے قدر ہے غیر معمولی انداز میں میرا استقبال کیا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اس ملاقات میں تین مرتبہ ایسا ہوا کہ جب بھی میں نے ان سے رخصت چاہی، انہوں نے اٹھنے نہ دیا بلکہ ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت بے تکلفی سے کہا دکتور! بیٹھے رہو کہاں جاؤ گے؟ میں نے کہا گھر۔ کہنے لگے، گھر جا کر کیا کرو گے؟ تھوڑا وقت ہمیں بھی دے دیا کہ وہ اور میں ان کے کہنے پر قیوں مرتبہ بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں انہوں نے چائے کا بھی پوچھا مگر میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ اس لیے چائے نہیں پیوں گا۔ مگر شاید وہ خود پینا چاہتے تھے اس لیے منگوائی اور اس دوران میں بھی ان کی اجازت سے گھر آ گیا۔ ملاقات میں پتہ چلا تھا کہ اگلے دن انہیں اسلام آباد جانا ہے۔ اور جامعہ میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار کے انتظامات بھی ان کے ذمہ ہیں یہ وہ سیمینار تھا، جو ان کی زندگی کا آخری سیمینار ثابت ہوا۔

ماہ رمضان میں مرحوم جس اشہاک اور خلوص سے مسجد میں نماز تراویح کے لئے آیا کرتے تھے وہ مناظر بھی قابل یاد ہیں۔ باعوم عشاء کی اذان وہ گھر میں نہیں مسجد میں آ کر سنتے تھے۔ پھر پہلی صف میں بیٹھنے کا خصوصی اہتمام کرتے۔ ان کی یہ ادائیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مرحوم ایک دن میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے ایک فتویٰ لینا ہے کیا تم فتویٰ دے سکتے ہو؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور مسکرا کر پوچھا۔ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے؟ کہنے لگے وراثت کا مسئلہ ہے، میں نے کہا پوچھو! کہنے لگے میں لکھ کر پوچھوں گا۔ پھر اگلے روز وہ میرے پاس آئے اور استفتاء میرے ہاتھوں میں تھا وہی۔ پھر تفصیلی جواب کے طالب ہوئے۔ یہاں عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ حمایت حق کی جو خوبی اس وقت میں نے ان کے اندر پائی وہ یہ تھی کہ وہ فقط خدا خوفی کے باعث شریعت اسلامیہ کے مطابق وراثت کی تقسیم چاہتے تھے، خواہ ان کے اپنے حصے میں کچھ آئے یا نہ آئے؟ اور یہ دراصل ان کے اپنے من کی وہ گہی پکار تھی، جو ان کا شعار بن چکی تھی۔ رزق حلال کمانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور وہ اکثر ایسی ہی باتیں کرتے نظر بھی آتے تھے۔ دوسروں کو ترغیب بھی دہائی

ہی باتوں کی دیتے تھے۔ بظاہر تو وہ جوان تھے۔ مگر قدرت نے انہیں دماغ کسی "بزرگ تاج" کا دیا تھا۔

وہ حد درجہ قابل اعتبار تھے اور رازوں کے امین۔ انجمن اساتذہ کے وہ صدر بھی رہے۔ اور جنرل سیکریٹری بھی اور موجودہ شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر جیر زادہ محمد قاسم رضا صدیقی کے میڈیا ایڈوائزر بھی اور اس کے علاوہ بھی متعدد عہدوں کے حامل رہے۔ اس عرصہ سیاست و خدمت میں ان کے پاس متعدد اساتذہ کی تحریری شکایتیں موصول ہوئیں مگر وہ کسی کو یہ نہیں بتاتے تھے کہ کس نے کس کی شکایت لکھ کر بھیجی ہے۔ الا یہ کہ خال خال۔ تاہم جسکے بارے میں شکایت ہوتی اسے بھی اور جو شاکی ہوتا اسے بھی سمجھانے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔ اور نیک مشوروں سے نوازتے تھے۔ مرحوم نے پسماندگان میں بیوہ پانچ بیٹیاں اور ایک دو سالہ بیٹا یادگار چھوڑا ہے۔ اللہ ان سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے۔ (آمین)

موت سے کس کو رستگاری ہے؟

آج وہ کل ہماری باری ہے

عرب اور موالی

(تحقیق مقالہ برائے پی ایچ ڈی)

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

صفحات: ۳۳۸

قیمت: ۳۰۰ روپے

ناشر: قرطاس

پی او بکس 8453

کراچی یونیورسٹی، کراچی

نام کتاب: احادیث القرآن (قرآنی حدیثیں)

نام مصنف: ڈاکٹر ازہر ازہری

سن اشاعت: ۲۰۰۶ء

قیمت: ۱۲۰ روپے - صفحات: ۱۵۳

ناشر: ایس ایس ٹریڈرز انٹرنیشنل کراچی پی او بکس ۱۸۰۷

تبرہ نگار: محمد اعظم سعیدی

ڈاکٹر ازہر ازہری کے

تزوئیک ذخیرہ احادیث چونکہ

حضور اکرم ﷺ کے وصال سے

تقریباً دو سو سال بعد جمع ہوا ہے

جبکہ رسول اللہ ﷺ سے براہ

راست سماعت کرنے والے

صحابہ بھی بقید حیات نہ تھے کہ وہ

اپنی ذات سے منسوب روایات کی تصدیق و تائید فرماتے اس لئے اس ذخیرہ کو احادیث کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس حوالے اس ان کی پہلی کتاب کا نام "قرآن و حدیث" ہے جس میں انہوں نے اپنے نقطہ نظر سے یہ ثابت کیا ہے کہ بخاری و مسلم سمیت جو کچھ حدیث کی کتابوں میں حدیث کے نام سے موجود ہے وہ سب سنی سنائی ناقابل اعتبار روایت ہیں اور ان کتب حدیث میں حدیث ایک بھی نہیں ہے۔

زیر نظر کتاب "احادیث القرآن" اسی سلسلے کی دوسری کتاب ہے جسکے تعارف میں احادیث رسول کے زیر سایہ احادیث قدسیہ پر بھی آلات سرجری استعمال کر کے سابقہ عنوان کے ضمن میں لکھا گیا ہے کہ احادیث رسول اور احادیث قدسی خود قرآن مجید میں موجود ہیں۔ قرآن سے باہر مختلف کتب احادیث میں جو احادیث قدسی یا احادیث رسول کے نام سے معروف و مشہور ہیں وہ روایت پرست حضرات نے ادھر ادھر سے سن سنا کر اسے روایت کا نام دینے کے بجائے قرآن سے لفظ حدیث چرا کر اسے حدیث رسول اور حدیث قدسی کا نام دے دیا ہے۔ بعد ازاں حسب روایت و تنقید و اعتراضات کا طومار کہ شیخ الحدیث کا عہدہ حاصل کر لیا قرآن کے ساتھ تو صحیح نہیں لکھا جاتا مگر بخاری و مسلم سے پہلے صحیح لکھا جاتا ہے حافظ قرآن کے مقابلے میں حافظ حدیث کی اصطلاح گھڑی گئی۔ محیر العقول اور غیر معمولی حافظہ عربوں کا تھا مگر صحاح ستہ کے مؤلفین ایرانی ہیں جیسے سنی و استہزائی اعتراضات ہیں جو صدیوں سے دہرائے جا رہے ہیں اور بالآخر استیجاب انکے جوابات بھی دیئے جا رہے ہیں۔

البتہ ڈاکٹر ازہر کی اس بات میں واقعی وزن ہے کہ دو صدیوں بعد صحیح کی جانے والی روایات کو من و عن رسول اللہ کے الفاظ یعنی حدیث رسول کہا جائے یا انہیں روایات کا نام دیا جائے۔ اور مؤلف کا کلیہ نظریہ ہے کہ ان کو روایات کا نام دیا جائے۔ مگر یہی مؤلف اپنے اس موقف سے اس وقت گریز کرتے نظر آتے ہیں جب وہ کتب احادیث کا استہزاء اڑاتے ہوئے احادیث کے ساتھ ساتھ روایات کی نفی کر جاتے ہیں یعنی جب دونوں کی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں تو پھر حدیث کو روایت کہنے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے ہاں ہم ان کا موقف یہی ہے کہ جو کچھ ہے قرآن ہے حدیث کا کوئی وجود نہیں ہے نیز قرآن میں حدیث کو ہی قرآن کہا گیا ہے اور اپنے اس قول کی تقسیم وہ اس طرح کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں کل اکیس مرتبہ لفظ حدیث مذکور ہوا ہے سورہ نساء آیت ۸۷، ۵۰۔ یوسف آیت ۱۱۱۔ کہف آیت ۶۔ زمر آیت ۲۳۔ جاثیہ آیت ۶۔ نجم آیت ۵۹۔ طور آیت ۳۴۔ واقعه آیت ۸۱۔ القلم آیت ۴۴ میں جو لفظ حدیث آیا ہے اس سے مراد قرآن مجید ہے جبکہ سورہ نساء آیت ۳۴۔ ۸۷۔ ۱۱۳ اور سورہ تحریم آیت ۳ میں جو لفظ حدیث آیا ہے اس کا معنی بات ہے، اسی طرح سورہ ذاریات آیت ۲۳۔ نازعات آیت ۱۵۔ بروج آیت ۷۱۔ غاشیہ آیت ۱ میں حدیث سے مراد خبر ہے۔ اور سورہ النعام کی آیت ۶۸ میں حدیث بمعنی گفتگو اور سورہ لقمان میں لحوالہ حدیث بمعنی قصہ کہانی ہے۔ اس تقسیم سے مؤلف نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے حدیث کا اطلاق صرف اس لفظ پر ہوتا ہے جو قرآن میں وارد ہے یعنی قرآن سے باہر لفظ حدیث کی کسی نسبت کو وہ قبول نہیں کرتے۔

اس طرح مذکورہ تالیف میں قرآن و حدیث یا قرآن و سنت کی اصطلاح کو بھی لائق اعتناء نہ سمجھتے ہوئے اس ترکیب کو مفروضہ قرار دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مؤیدین حدیث کے نزدیک شاید آحادین قرآن میں ہے اور آحادین حدیث یا سنت میں ہے یعنی موصوف کے نزدیک دینی عقائد و نظریات، اور امر و نہی، اخلاقیات و معاملات، مکیالی موزونی معاشرتی ضروریات کا ماخذ صرف اور صرف قرآن مجید ہے احادیث مجموعی طور پر مفروضہ محض ہیں۔ پھر مؤیدین حدیث کی طرف سے خود ہی ایک آسان سے سوال کا جواب دے کر (ص ۳۹-۴۰) سے استہزاء اڑا دیتے ہیں۔ جس سے قاری کی تشفی نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر ازہر نے کتب احادیث اور مہمود ذہبی احادیث کی سرچری میں تو کمال فن کا مظاہرہ دکھایا ہے مگر افسوس کہ آلات سرچری مقام آپریشن میں ہی کھیر بیٹھے ہیں مثلاً سورہ نساء کی آیت ۸۷ میں لفظ حدیث ایک مرتبہ آیا ہے مگر ترجمہ میں وہ حدیث بھی لکھتے ہیں بریکٹ میں قرآن بھی لکھتے ہیں اور پھر بات بھی لکھتے ہیں یعنی (جو حدیث (قرآن) کی بات) جب حدیث کو قرآن کہہ رہے ہیں تو پھر قرآن کو بریکٹ کرنے اور پھر حدیث کا معنی بات کرنا چھ معنی دارد۔۔۔ اسی طرح سورہ رسائل کی آیت ۵۰ نہی حدیث بعدہ پونہ میں کیا ہے (حدیث (قرآن) کی اور کو نہی ایسی بات ہے) اس قسم کی مزید مثالیں بھی موجود ہیں یونہی سورہ یوسف کی آیت ۱۱۱ کا ترجمہ مکمل کیا ہے۔ سورہ نساء کی آیت ۸۷ کا ترجمہ مکمل ہے ص ۵۷، سورہ نساء کی آیت ۳۶ کا ترجمہ مکمل ہے ص ۵۸۔ سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۸، ۱۱۷ اور ۱۱۶ کی ہے مگر ترجمہ صرف آخری جملے کا ہے ص ۶۷۔ بعض تراجم آیات تو موضوع سے متعلق حصے کے کیے ہی نہیں ہیں۔

اسکے بعد قرآن بحیثیت حدیث کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ ہم نے قرآن کو حدیث کا اصطلاحی نام اس لئے دیا ہے کہ یہ حدیث کی لغوی تعریف پر پورا اترتا ہے پھر اگلے صفحے پر لکھتے ہیں کہ قرآن میں ۲۱ مقامات پر حدیث کا لفظ موجود ہونے کے باوجود کسی ایک مقام پر بھی ہم کو حدیث محمد، حدیث رسول یا حدیث النبی کی ترکیب والے الفاظ نظر نہیں آئے۔ مگر حیرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب اسی ص ۳۰ پر قرآن کے صفاتی ناموں میں ایک نام ”قول رسول“ وہ بھی آیت قرآن سے ماخوذ کر کے خود ہی تحریر فرما چکے ہیں اور وہ قول اور حدیث میں معنوی یکسانیت سے واقف بھی ہوں گے۔ پھر بھی لکھ دیا کہ حدیث الرسول یا حدیث النبی کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے؟ ڈاکٹر صاحب کی کتب احادیث کے آپریشن میں انہماک و یکسوئی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ اس کا ناچینی میں قرآنی آیات کی تعداد پر بھی بلینڈ پھیر گئے اور آیات کی تعداد ۶۲۳۶ کر دیں۔

ڈاکٹر ازہر نے قرآنی آیات کی تقسیم میں بھی بڑی عرق ریزی فرمائی ہے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے قرآن مجید کو احادیث القرآن کا نام دیا پھر ان میں سے احادیث قدسیہ کو الگ فرمایا۔ اور فرمایا کہ جو آیات یا ایھا الذین امنوا۔ یا ایھا الناس، یا اھل الکتاب اور یعنی آدم سے شروع ہوتی ہے یہ آیات درحقیقت احادیث قدسیہ ہیں۔ اسکے بعد لکھتے ہیں وہ آیات جو لفظ